شیشندر شرما

(تلگو شعری مجموعہ "شیش جوتسنا" کا اردو ترجمہ)

مترجم

ڈاکٹر غیاث صدیقی

انڈین لینگویجس فورم نے شائع کیا

دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۰ء

قیمت : ۹ روپئے
سرورق : سعید بن محمد نقش
کتابت : افتخار النساء بیگم (مخفی معین مرکز خوشنویسی)
مطبع : اکسل فائن آرٹ پریس، محبوب چوک حیدرآباد

تعداد ..... پانچ سو

بہ تعاون وتشکر ایچ ۔ ای ۔ ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ

زیر اہتمام : انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد
دبستانِ دکن وادارۂ اردو اکیڈمی گل برگہ وروزنامہ "سلامتی" گل برگہ

ملنے کے پتے

"گیان باغ" ــ گوشہ محل ــ حیدرآباد
غیاث صدیقی ؛ بتوسط مسز جی اے خاں پرنسپل رہانی
مخفی معین یادگار مرکز خوشنویسی کالی کمان (22-5-242)
حیدرآباد 500002 اے پی انڈیا)

انتساب

رفیقۂ حیات
راجکماری اندرا دیوی دھنراج گیر کے نام

شیتندر شرما

غیاث صدیقی کی تصنیفات تالیفات اور تراجم

آواز کا رنگ ۱۹۷۳ء شعری مجموعہ Rs: 15/-

آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ۱۹۷۶ء میں انعام دیا

قفس رنگ ۱۹۷۶ء شعری مجموعہ Rs: 15/-

آندھرا پردیش اور اترپردیش اردو اکیڈمیوں نے ۱۹۷۷ء میں انعامات دیئے

نیلم کے پنکھ ۱۹۷۲ء قیمت Rs 7-50

شری شیشندر شرما کی جدید ترین بیس تلگو نظموں کا اردو ترجمہ ایک ہی سال میں پہلا ایڈیشن فروخت ہوگیا اس لئے یہ دوسرا ایڈیشن ہدیۂ ناظرین ہے۔

(زیرِ طبع کتب)

دستاویز — شعری مجموعہ

رنگ مالا — شعری مجموعہ (دیوناگری رسم خط میں)

قطب النساء بیگم مخفی کی حیات اور کارنامے (تحقیق)

دکن کے ممتاز نیم عصر (شاعر، ادیب، نقاد)

گونگا درد — انشائیے اور خاکے

"غیاث صدیقی — شخصیت اور فن" از وہاب عندلیب ایم اے، بی ایڈ (عثمانیہ)

قیمت چھے روپئے سکہ ہند

تعارف

جی شیشندر شرما، تلگو کے عصری ادب میں ایک قد آور شاعر اور ایک صاحب نظر نقاد اور اسکالر کی حیثیت سے قبولیت خاص و عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ والے تلگو کے بزرگ و محترم شاعر وشوناتھ ستیہ نارائن نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"ان کی شاعری کا معیار بہت اونچا ہے...... تلگو ادب میں آج بہ مشکل دس شاعر ملیں گے جو ان کی شاعرانہ مرتبت تک پہنچ سکتے ہیں"

سویت نہرو ایوارڈ یافتہ تلگو کے نامور شاعر سری سری نے جن کی شاعرانہ مرتبت کو ہندوستان سے باہر کی شعری اور ادبی دنیا میں بھی مانا جاتا ہے شیشندر شرما کی نظموں کی تعریف کرتے ہوئے شرما کی شاعری کو فرانسیسی شراب سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "ان کی نظموں میں ایسی حیرت انگیز لفظی تصویریں ملتی ہیں جو اقلیم سخن میں کہیں نہیں دکھائی دیتیں"

سنسکرت اور تلگو کے ایک اور نامور شاعر، اسکالر اور نقاد "پتاپرتی نارائن آچاریہ نے ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے

"ان کا طرز اظہار بے حد پر وقار اور سحر انگیز ہے۔ آج ہمیں شاذ و نادر ہی ایسے کامیاب اور باکمال شاعر ملتے ہیں۔"

شیشندر شرما، ایک ذہین، حساس اور پڑھے لکھے قلم کار ہیں، انھوں نے علوم متداولہ، عالمی ادبیات اور فنون لطیفہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور سالہا سال سے ان کا قلم علم و حکمت اور شعر و ادب کے مختلف شعبوں میں متحرک ہے۔ ان کی نثری اور شعری تخلیقات کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ترجمے کے فن پر بھی انھیں عبور

حاصل ہے سنسکرت کے شہرۂ آفاق شاعر کالیداس کی طویل اور کلاسیکی نظم "میگھ دت" کے علاوہ شاہنامۂ فردوسی کے "رستم وسہراب" والے حصے کو بھی انھوں نے بہت خوش اسلوبی کے ساتھ تلگو میں منتقل کیا ہے نیز فرانس کے مشہور شاعر چارلس بودلیر کی متعدد نظموں کا بھی تلگو میں ترجمہ کیا ہے۔ راجکماری اندرا دھن راج گیر نے — جو خود انگریزی کی ایک شیوہ بیان شاعرہ ہیں — ان کی ایک طویل نظم "دیتو گھوش" (موسموں کی پکار) کو بہ حسن تمام انگریزی کا لباس پہنایا ہے۔

شیشندر شرما کئی زبانیں جانتے ہیں۔ انگریزی پر انھیں پوری قدرت ہے اور کبھی کبھی انگریزی میں فکر سخن بھی کرتے ہیں۔ پچھلے چند سال کے اندر انھوں نے اردو میں بھی اتنی دستگاہ پیدا کرلی ہے کہ اب آسانی کے ساتھ اردو شاعری سے محظوظ ہو سکتے ہیں اردو ادب کی تاریخ اور اس کی رفتار ترقی سے بھی وہ ناواقف نہیں ہیں لیکن اردو دنیا انکی شاعری سے زیادہ متعارف نہیں ہے حالانکہ اردو اور تلگو کے میل جول کی داستان ایک پرانی داستان ہے تاہم یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اس دیرینہ قربت کے باوصف ان دونوں شائستہ زبانوں میں علمی اور ادبی لین دین کی روایت بہت کمزور رہی ہے بلاشبہ یہ ایک شگون نیک ہے کہ ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا نیا کاروان اس غفلت کی تلافی کا سامان بہم پہنچا رہا ہے اور آج ہندوستان کی سبھی زبانوں کے باشعور اہل قلم اور ارباب فکر و نظر یہ محسوس کرنے لگے ہیں اس عظیم ملک کی تاریخ و تہذیب اس وقت تک تشنہ دامن اور تہی دامن رہے گی، جب تک یہاں کی سب زبانیں اور تہذیبی دھارتیں باہمی لین دین کو اپنا نصب العین نہ بنائیں اور خوشی کی بات ہے کہ اس سمت میں کئی نتیجہ خیز قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔

شیشندر شرما کی نظموں کا زیر نظر مجموعہ "نیلم کے پنکھ" بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے اس مجموعے میں شرما کی ۲۰ نظمیں، انگریزی، اردو اور ہندی ترجموں کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں۔ انگریزی ترجمہ اندرا دھن راج گیر کے زور قلم کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی نے ان نظموں کو اردو میں منتقل کیا ہے — ترجمہ اور پھر شعر کا ترجمہ درجۂ اوّل کی تخلیقی صلاحیت، شاعرانہ بصیرت اور زبان و بیان پر بھرپور قدرت چاہتا ہے۔ اور پورے اطمینان کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر

غیاث صدیقی نے شیشہ گری کے اس کارِ نازک کو بڑی خوبی اور سلیقے سے انجام دیا ہے۔

"نیلم کے پنکھ" کا مطالعہ ہمارے ذہن میں پہلا احساس یہ پیدا کرتا ہے کہ شیشندر شرما کی شاعری حسن خیر اور صداقت کی شاعری ہے، زندگی کی ان برگزیدہ قدروں نے ان کی شاعری کے افق میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے زماں و مکاں کی بیکراں پہنائیوں کو شرما نے کچھ اس انداز سے اپنے اشعار میں سمٹ لیا ہے کہ ان کی شاعری گویا ایک جام جہاں نما بن گئی ہے ان کے اشعار کی جمالیاتی مسرت آفرینی اور ان کے اندازِ بیاں کی سحرکاری ایسی خصوصیات ہیں جو ہر قدم پر قاری کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے "نیلم کے پنکھ" کی نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ زندگی کے گوناگوں امکانات کی راہوں میں دور دور تک روشنی پھیل گئی ہے۔

شرما نے اپنی شاعری میں فن کی قدیم روایتوں کا بھی پورا پورا پاس و لحاظ رکھا ہے اور زندگی کے عصری تقاضوں کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ گویا ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ خانہ ہے۔ جس میں ماضی کی فردوس گمشدہ کے جلوے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور حال کی لمحہ بہ لمحہ متغیر ہوتی ہوئی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں جو شکلیں بدل بدل کر مستقبل کے خوابوں میں تبدیل ہوتی ہیں، روایات کے لہو نے ان کی شاعری کو آب و رنگ دیا ہے تو معاشرہ کے فرسودہ اور ضدی نظریوں سے بغاوت کی آنچ نے اس میں حرارت و توانائی پیدا کر دی ہے۔ زندگی سے ان کا کوئی جھگڑا نہیں ہے، تاہم زندگی کو جوں کا توں قبول کر لینے پر بھی، بہرحال وہ راضی نہیں ہیں۔ ہر بالغ نظر شاعر کی طرح وہ زندگی کے ترجمان بھی ہیں اور ایک نئی زندگی کے خالق بھی۔ ان کے گہرے تاریخی شعور اور حقیقت کے شاعرانہ ادراک نے ان کی آواز میں وقار اور ان کے لہجے میں اعتبار پیدا کر دیا ہے ان کے تخلیقی اظہار کی قوت بے پناہ ہے جس کا سرچشمہ ان کا وہ اندرونی وجود ہے جو غالبؔ کے الفاظ میں بجائے خود اک محشرِ خیال ہے ان کے دل پر خوں کی گلابی نے فطرتِ خارجی کے سارے رنگ سارے مظاہر۔ اپنے اندر سمو لئے ہیں، ان کا شاعرانہ ادراک ہر ذرّے میں چھپے ہوئے گلستان اور ہر قطرے میں پوشیدہ سمندر کے بھید کو پا لیتا ہے اور فطرت کے ان اسرار کو وہ اپنے فن کا حصہ بنا کر پیکر تراشی اور محاکات نگاری کے حسین مرقعے پیش کرتے ہیں۔

گگن کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑے
دو اودے اودے پرندے
جیسے دو نیلم پنکھ لگا کر اڑ جائیں
میں ان میں کہساروں پر گرنے والی برف
اور چاندنی کی ٹھنڈی جھلک پاتا ہوں

تم اک حسین حادثے کی جان ہو
جو میری ہزاروں رگوں میں
ایک آنکھ بن کر جاگ رہی ہے
میں کہ جیسے حادثۂ زندگی نے
ریزوں میں بانٹ دیا تھا
ایک اجنبی لمحے میں
تم نے ان کو یکجا کر دیا
اور میری زندگی پر
سکون کی شبنم برسادی

شرما کا احساس جمال حسن کا ایک آفاقی تصوّر بن کر جگہ جگہ ان کی نظموں میں بکھر جاتا ہے (تم)

دیارِ روم میں تم کو دیکھا
قدیم سنگریزوں کی عظمت میں
نقش و نگار کے آئینوں میں
اپنے پہلے محل کی چوکھٹ پر
درختوں کی شاخوں کے پیچھے
دور پہاڑوں کے عقب میں
سایوں کی طرح
ماضی کے نقش ناخن کی مانند
تم اک سجل شام کی صورت

سنور کر آئی ہو
اور اپنے سنگ
لمحۂ گریزاں کے گلابوں کو چرا کر لائی ہو (تم)

لمحۂ گریزاں کے گلابوں کی آرزو شاعر کے ذہن میں انفس و آفاق کی بیکرانی پیدا کر دیتی ہے اور اس کے شعورِ ناشاد کو بھی شعورِ شادماں کا جرعہ کش بنا دیتی ہے۔

ہنگامِ شب
خاموشی کی مکڑی
ناامیدی کے جالے بن رہی ہے
بس ایک آنسو
گوشۂ چشم میں لرزاں ہے
یہ غم کا سفیر
تنہا تنہا
شانِ خسروانہ سے خراماں ہے (دھندلکے سائے)

تلگو کا یہ جمال پرست شاعر چاہے وہ حسن و محبت کے رنگ بکھیرے یا کربِ حیات کے زخم سجائے یا وقت کے گریزپا لمحوں کو پکڑنے کی کوشش میں خود آبلہ پا ہو جائے ہر حال میں اپنے لہجے کی نغمگی اور اپنی آواز کے دھیمے پن کو باقی رکھتا ہے شرما کے طرزِ ادا کی یہی خوبی اور سلیقہ مندی ہے جس نے ان کی شاعری میں تاثر کا جادو جگا دیا ہے۔ شرما کی حسیت جتنی تیز ہے اس کے اظہار کی کیفیت اتنی ہی لطیف ہے جس کی بدولت ان کی شاعری کا شعلہ شبنم پوش بن گیا ہے شرما کی نظموں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہنی سفر میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں۔ اس کے خواب ہمارے خواب ہیں، اس کے دل کی دھڑکنیں ہمارے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ اسکی تمنائے نشاط ہماری تمنائے نشاط ہے اور اسکا کربِ محرومی ہمارا کربِ محرومی ہے شاعر اور قاری کے سارے درمیانی فاصلے ٹوٹ جاتے ہیں اور دونوں میں یگانگت کا ایک گہرا حسی رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور بلاشبہ سر اچھی اور بڑی شاعری کا اعجاز یہی ہے کہ وہ اپنے باشعور قاری کو بھی اپنا ہم دم و ہم نوا بنا لیتی ہے۔

شرما نے اپنی شاعری میں جن آدرشوں، جن خوابوں اور جن تمنّاؤں کو پرویا ہے اس کے سرے ازل دابد سے مل جاتے ہیں اور یہی وہ مقامِ عرفان ہے جہاں پہونچکر شاعر کا وجودی تجربہ ایک کلی تجربے کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور فن میں آفاقیت سانس لینے لگتی ہے۔

شرما کا شاعرانہ وجدان، جہاں جہاں، زندگی اور انسان کے سنہرے مستقبل کی بشارت دیتا ہے، ان کے اشعار میں ایک پیغمبرانہ قطعیت پیدا ہوجاتی ہے۔

اے جانِ بہار
ہم نئے آدم کو دھوم دھڑکّے سے
لوٹتا دیکھیں گے

سنو
تاریخ کے غاروں میں
اس کی آواز گونجتی ہے
یہ آواز ایک دن
تمام کھوٹے سکّوں اور جھوٹے انسانوں کو
صلیب پر چڑھا دے گی (نئے ساحل)

ان کی نظم "انسان" میں بھی ہم ایسی ہی فیصلہ کن آواز سنتے ہیں:۔

کتنے چیختے طوفانوں
کتنے خاموش ساحلوں
کتنے دہکتے سورجوں کو چھوکر
سحر
انسانیت کے دل سے طلوع ہورہی ہے

اور ان کی معرکتہ الآرا نظم "دو نسلیں" ان کی شاعرانہ صداقت کی بے باک ترجمان بن کر یہ صدا دیتی ہے کہ ـــــ نئی نسل جس کے لئے ہم نے صرف آنسو، زخم، خون، عسرت، ریاکاری اور بزدلی کا سرمایہ چھوڑا ہے۔

ماضی کے خشک ہونٹوں تک

سورج کے
دریاؤں کو کھینچ لائے گی

عبارت مختصر، شیشندر شرما کی شاعری، ذہنوں کو تقسیم کرنے والے آہنی پردوں کو چیرتی ہوئی ان سرحدوں تک پہنچ گئی ہے جہاں

انسانیت کا سورج
ذہن کے ایوانوں میں معلّق ہے
گویا شعلوں کا خوشہ
برگِ خشک کی مانند
بولیاں اڑ رہی ہیں
ملکوں کی سرحدیں تھرا رہی ہیں
طوفانی ہواؤں میں انسانیت کی آنکھیں
نئے حادثوں کی مے پینے کو کھلی ہوئی ہیں
(طوفان)

ہمیں یقین ہے کہ اردو کے اصحاب ذوق "نیلم کے پنکھ" کے مطالعہ سے خوش وقت بھی ہوں گے اور نئی روشنی بھی پائیں گے ——

ترتیب

سفینے رواں دواں

(شیخ مجیب الرّحمٰن کی نذر)

سورج چمکا
جیسے لہو کے دریا میں
آکاش سے ٹوٹا اور گرا

بم برسے
پھر موسم کے اور جیون کے
رنگین چہروں پر خاک اڑی
ننھّے پرندوں کے سینوں سے
میٹھے سروں کی چوری کر کے
شب بھاگی، آگ
کروروں آنکھوں سے
بس اُبل پڑی
ایک بھیانک چیخ
جیسے نکل پڑی

سوتی صدیاں جاگ اٹھیں
اور وقت کی سرحد ٹوٹی
پھر آوازوں کا سرگم
رقص کناں اور عکس فگن

سانسوں کے سرخ سمندر میں
ایسا ٹوٹا
جیسے اک شریان کٹے اور خون بہے
پھر سارے جگ کو لے ڈوبے
یہ سب کچھ کیا تھا
دھرتی کے پھٹ پڑنے کا
ایک دھماکا تھا
یا کوئی پیدا ہوا تھا
جاگا تھا
جھولے میں پھاند پڑا تھا
تاکہ سانس ملے
سورج کو دیکھ سکے
اپنے پنکھوں سے

اڑتا پھرے

افلاک کی سیر کرے

اے پیاری زمین

اے پیارے وطن

مسروقہ میٹھے گیتوں کو

اب ڈھونڈ نکالو

جہاں جہاں نفرت کے نشیمن ڈالے تھے

وہاں وہاں تم پریم کے دیپ جلاؤ

گوشہ گوشہ چمکاؤ

مانو سے آکاش تلک

الفت کے نغمے گاؤ

بے چاری یہ پیاسی دھرتی

قتل کے ساغر پی کر

زخم نگل کر

ہاتھ اٹھائے

شیروں کا منہ بند کرے

گرم جوانی کے خوں سے

ماں بہنوں کے ماتھوں سے
گُم گُم پچھیٹے
دھوئیں کے بادل میں بہنے کو
یاقوتی چہروں کے پَردو
ہیروں کی یادوں کے پنکھ لگاکر اُڑجاؤ
آکاش کے تاروں میں مل جاؤ
اور ہمیشہ چمکو

کیا نسلِ انسانی پر
پابندی ہو سکتی ہے؟
کیا شیروں جیسے سمندروں کے
پاؤں میں بیڑی ڈالی جاسکتی ہے؟
کیا نبضوں کو روکا جاسکتا ہے
کیا صحرا میں آندھی کو قید کیا جاسکتا ہے؟
اے نادان!
سُن تو ذرا!
اک اونچی ملکوتی پاک ندا

کوہ و صحرا سے
وقت کی، صرصر کی سانسوں سے
امیدوں کے، خوں کے لبادے پہنے
ملکوں کی سرحد کو
ٹھوکر سے مٹاتی آزادی نکلی ہے
راہ کے پتھر ڈھوئے
جشنوں کو کچلے
جذبات کو روندے
دریائے مواج کی مانند ابھری ہے
آزادی کی دیوی اپنے گھر آئی ہے
اپنی وادی میں ٹھہری ہے
اپنی دکھ بھری ابرو
کہساروں پر
سستانے کو رکھ دی ہے
سحر کی ایک کرن
آہستہ سے آکر
آزادی کے ماتھے سے

خون کے دھبّے پونچھے گی

کل تک تو یہ سورج

اک پھوڑا تھا

آج یہ یاقوتی ہاتھوں سے

ہیرے موتی چھڑکے

کل تک تھا

زخمی کھیتوں میں شیطانی کھیل

آج زمرُّد جیسا تازہ سبزہ ہے

نقشِ قدم شہیدوں کے

جیسے خوشی سے رقص کرے

جنگل میں مُور

گنگا کے کنارے کھیلنے والے بچّے

برہم پتر کے ساحل پر

کشتی ڈالے

آزادی کے پانی میں

بہتے رہتے ہیں

وقت کے دھارے بدلتے ہیں

ہمالیہ کی چوٹی پر مسکانیں ہیں
نئی محبّت کی نسلوں کی
چیخوں کو اور گونجوں کو
اپنے قریب بلاتی ہیں
اپنے زانو پہ
سُلاتی ہیں
اے صبح کی معصومی
ایک نیا سورج
سونے کے پانی سے
تجھ کو نہلاتا ہے
قسمت کا اک عہد زرّیں
کیسی پیاری دھرتی تجھ کو عطا کرتا ہے

●●

یہ آنکھیں

(شادی کے دن ۱۶ر جون ۱۹۷۱ء ہالینڈ میں یہ نظم انگریزی میں رفیقۂ حیات راجکماری اندرا دیوی (دھنراج گیرجی) کے لئے کہی گئی)

شاید ایک دوسرے میں
ہم پنہاں پنہاں تھے
ہجوم زندگی سے پرے
سچائی کی تلاش ہے
ان آنکھوں کے دوآبے میں
جو دراصل سونے اور سیاہ نیلم کے خزانے ہیں
میں دیکھ سکتا ہوں اس روح کو
جو ہمالیہ کی چوٹی کی مانند کھڑی ہے
اور ستاروں کو چھوتی ہے
جس میں میرا معطر ماضی بسا ہوا ہے
شہنائی پچھلی زندگی کے کہساروں اور وادیوں میں
گونج اٹھی ہے
اور راگ ہنڈول
پریوں کی طرح

مہتاب کی کرن کرن سے
مرے جیون کے صحرا میں اتر رہا ہے
جہاں سحر بے آواز ہے
اپسرائیں زریں ملبوس میں
اپنی زلفوں کو چھپائے
ایک مکمل دنیائے خواہشات میں
خراماں ہیں
جہاں ہونٹوں کی مسکراہٹ
چمپئی چہروں پر چمکتی ہے
باغوں میں، محلوں میں
جہاں حسینائیں موسموں کے گیت گاتی ہیں
جہاں ہرنی کی آنکھیں مسکراتی ہیں
اور مور ناچتا ہے

ان شہروں میں وندھیا سے پرے
پربتوں، کھیتوں اور قلعوں میں
جو راجستان کی ریگِ صحرا میں
موتیوں کی طرح بکھرے ہیں

ان تصویروں کو میں نے
اپنے بزرگوں کی کتابوں میں
ایک آنکھ بن کر
ہر بنِ مُو سے پڑھا تھا
اک تنہا بچّے کی طرح
خاموش
سیڑھیوں پہ بیٹھا تھا
پچھلی زندگیوں کو تلاش کرتا ہوں
تحت الشعور میں میں نے ایک حسن کھویا تھا
جیسے اب پا گیا ہوں
نئی صبح کے افق پر
میرے ناآفریدہ بچوں کے خالق
ان دو آنکھوں میں
مسکراتے نظر آتے ہیں

●●

نئے ساحل

(نئے سال پر)

خلا
عمیق سے عمیق تر ہوتی جاتی ہے
مجھے گرفت میں لے لیتی ہے
گرجتا ہوا پیام
میرے کانوں میں رس گھولتا ہے
کیا تم ابھی اسی یقین پر قائم ہو
کہ یہ دن رسولوں کے اور صلیبوں کے ہیں

یہ دن
زندگی کو صلیب کی مانند تراشتے ہیں
اور آدم کو ابنِ مریم کی صورت میں ڈھالتے ہیں
نئے عہد کا سورج ابھر کر
اپنے ہونٹ کھولتا ہے

ایک نئے عہدنامے کا تحفہ لاتا ہے
یہ موت اور حقیقت پسندی کی مقدس کتاب ہے۔

انسان
آکاش لوک کے واسیوں کی مانند
آزاد و بے زنجیر ہے
ایک زمانے کی جرائت ہے
ایک نئی قوت بن کر
ایک نئی راہ پر
قدم سے قدم ملا رہا ہے
زمین کے اِس کنارے سے اس کنارے تک
اِس ساحل سے اس ساحل تک
نہیں بلکہ افقوں کی رہگذار میں
ایک نیا پیامبر
سابقہ پیام بر کے مقابل آئے گا
اس گَرُڈ[1] کی طرح
جو نغمۂ ناشنیدہ

---

[1] یعنی وشنو کا مرکب یا طائر

اپنے گلے میں روکے ہوئے ہو
انسانی فہم کے کناروں سے پرے
وہ صلیب پر نئی چاندنی اور سنہری روشنی کا طوفان
لائے گا

چلو، اے جانِ آرزو
طوفانی باڑھ میں جست لگائیں
اور آنے والی
کل کی جلتی ہوئی سحر دل پر
اپنے لب رکھ دیں
وقت کی چراگاہوں میں
خوف اور غصّے کی ندیاں جاگرتی ہیں۔
جہاں تم اور میں
دو معصوم کلیاں
جیون ہریالی کی زبانوں پر چٹکی ہوئی ہیں
کاسنی سحروں کی نکہت
بارود کی بوٗ

ایک یاد کو جگاتی ہے

جنگ کی ہوس اور جذبات زندہ ہو جاتے ہیں

تاریخ نظریوں کی دھول کے ساتھ گزرتی ہے

نعروں کی آواز گونجتی ہے

اسی طرح

جیسے دور کے کہساروں پر افق کے قریب' دھواں

آسمان کی پیشانی پر

لکیریں بن جاتا ہے

اور غبار

جھکتے ہوئے آسمانوں میں

غیر متوقع سحروں کے ایوانوں سے

گزر جاتا ہے

اور اس عہد کے گزر جانے کے بعد

ہم دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں

گیت گاتے ہوئے

اور بے بنیاد دلیل کے گلدستے اچھالتے ہوئے

اے وقت کے نوخیز بچے

اے دودھ کے سمندر

اے چاند!
تمام ضدی نظریوں کے پیراہن
تار تار کر ڈال

اور خوبصورتی کے مصنوعی ملبوس کو ترک کر دے
جو مسیح کی مانند
ایک شفاف نور
نازک انگلیوں کو
بے آواز ابد کے آسمانوں میں اچھالتا ہے
ہریالی اور غنچوں کو چھوتا ہے
موروں سے کھیلتا ہے
ایک سادہ گیت کی طرح
یہ خواہش ہے کہ طوفانی سمندروں کی للکاریں
گھل جائے
ذہن کے شاہین
جنھیں دور خواب کے دریچوں میں سے دیکھا تھا
جن کی پرواز کو

نیلی روشنی میں پرکھا تھا
جن کا گیت صرف آنسو ہے
ان میناروں سے ٹپکتا ہے
جن میں ممتا کی آنکھیں جل رہی ہیں
زلزلہ پھنکارتا ہے اور ڈستا ہے
جذبات کے خس و خاشاک کی طرح
لاوا اُبلتا ہے
اور انسان کو ڈھکیلتے ہوئے
زندگی کے دوسرے کنارے تک
پھینک دیتا ہے
جیسے انسان
ایک کنارے سے دوسرے کنارے کے درمیان
کروٹیں بدلتا ہے
جیسے دمکتا سورج
مشرق اور مغرب کے درمیان
وقت کی ہمہ رنگی لہروں پر
اندھیرے اُجالے کے بیچ

کروٹیں لیتا رہتا ہے
وقت
یکسانیت کے بر عکس
رنگ بدلتا رہتا ہے
جو عقیدتوں کو جھٹلاتا ہے
اے آدم سُن
بہکتی ہوئی نئی نسل کے نقوشِ قدم کو
کلیسا کے دروازوں پر
نئی نسل کا بوجھ
مندروں کی دیواروں پر کئی انگلیوں کے نشان
مورتیوں اور دیوتاؤں کے قریب
دلوں کے زخموں سے خون رس رہا ہے
انسان کفِ افسوس مل رہا ہے
عرضِ مبہم اور مایوسی کے زرد سایوں میں
گھرا ہوا ہے
مگر اس ورق کے پلٹنے سے پہلے
اے جانِ بہار

ہم نئے آدم کو دھوم دھڑکّے سے
لوٹتا دیکھیں گے
سنو
تاریخ کے غاروں میں
اس کی آواز گونجتی ہے
یہ آواز ایک دن
تمام کھوٹے سکّوں کو اور جھوٹے انسانوں کو
صلیب پر چڑھا دے گی

●●

تم

(وینس ڈیمیلو سے متاثر ہو کر اکتوبر ۱۹۷۰ء میں بمقام روم کہی گئی)

کچھ تو بولو
میرے دیارِ چشم میں اک خواب
دھنک کی طرح بکھر گیا ہے
وہ دھنک
جو دور آکاش کے کناروں سے
اترتی معلوم ہوتی ہے
ان ہونٹوں کو وا کر دو
جو روشِ برگِ گل ہیں

اے پری وش
میرے معصوم ماضی کی لہروں میں
وقت کی کیاریوں میں
گہری نیند میں
کتنے یگ تم سوتی رہی ہو

گلاب کھلے، مرجھائے
خزاں کی نذر ہوئے
لیکن تم
تمہارے نازک چرنوں میں ارپن ہونے والے
گلابوں کو لینے کے لئے
کیوں نہیں آئیں

دیارِ روم میں تم کو دیکھا
قدیم سنگ ریزوں کی عظمت میں
نقش و نگار کے آئینوں میں
اپنے پہلے محل کی چوکھٹ پر
درختوں کی شاخوں کے پیچھے
دور پہاڑیوں کے عقب میں
سایوں کی طرح
ماضی کے نقشِ ناخن کی مانند
تم ایک سجل شام کی طرح سنور کر آئی ہو
اور اپنے سنگ

لمحہ گریزاں کے گلابوں کو
چرا کر لائی ہو

اے روم کے غروب ہونے والے آفتاب
میری آنکھوں میں
زرد تمناؤں کو تم نے
پرت پرت اتار دیا ہے، جیسے
کسی مائیکل اینجلو کے قلم سے
دھنک کے غم انگیز درد
ٹپک گئے ہوں

وہ آنکھیں
نیل گگن کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑے
دو اودے اودے پرندے
جیسے دو نیلم
پنکھ لگا کر اڑ جائیں
میں اُن میں

کہساروں پر گرنے والی برف
اور چاندنی کی ٹھنڈی مہک پاتا ہوں
جہاں مغرب کے کناروں میں ریت پر
انسانی فکر کی برسات ہوتی ہے

میں ان میں
ان سلطنتوں اور شہروں کے
عروج و زوال دیکھتا ہوں
جو صدیوں کے طاقتور شانوں پر
سو گئی تھیں

جب تم کو پایا
تو دنیا کو کھو بیٹھا
نیند کی میٹھی جھیل میں

ایک نازک خواب
ہنس کی طرح بہنے لگا ہے

دور بہت دور
میں آسمانوں کے نیلے سناٹوں میں کھو گیا تھا

اور بکھر جاؤ گا
افق کی باہوں میں
جذبات کے بگولے کی طرح
میرے تخیل کو تم نے
نئے پنکھ دیئے ہیں
قوت پرواز دی ہے
آخر کچھ تو بولو
اس سے پہلے کہ یہ لمحۂ شب
گزر جائے

یہ رات
جس میں گلہائے آہ کشیدہ کی سانسیں
ہم قدم ہیں

کہو
تم کتنی راتیں
نقروی چاندنی کی موجوں میں
نہا چکی ہو، کہو
بادِ صبا کی کتنی زلفیں

تمہارے مرمریں شانوں کو چومتی ہوئی
افق میں گم ہو گئیں
کیا میں تمہارے
صندلیں بدن پہ
اپنے ہونٹوں کے جلتے ہوئے نقوش
چھوڑ سکتا ہوں
بس یہ رات گزر جانے سے پہلے
دل کا بوجھ ہلکا کر ڈالو

کس بت تراش نے
کتنے پریم نگر
تمہاری آنکھوں میں
تراش ڈالے ہیں
کہو
کیا ان آنکھوں سے
تم دیکھ رہی تھیں
ساگروں کا، شہروں کا نشیب و فراز

جاگتے ڈوبتے سورج کے رنگین پنکھوں پر
وقت کا پنچھی
مسکراتا اڑتا رہا
اس وقت تم صورتِ سحر روشن تھیں
اور گلِ یاسمین کی طرح مہکتی تھیں
کتنے مسافر
امیدوں کی روشوں سے گزر گئے
تم نے محبت کے سنہرے تار سے
کتنی زندگیوں کے لبادوں پر
پریم کے پھول کاڑھے
کتنی آنکھوں میں تم نے
نرم مہین اور ریشمی خواہشوں کے دھاگوں سے
قول و قسم کے نشان
اور امیدوں کے نشیمن بنائے

آؤ
مجھ سے کہہ ڈالو

اس سے پہلے کہ وقت کا کاروان
اور آخری رینگتا ہوا لمحہ
میری زندگی کے صحرا کو چھو لے
کیا تم میری منزل کی طرف جا رہی ہو
میری کشتِ آرزو کو روندتے ہوئے
اپنے بدن کے بے داغ موتیوں کو بکھیرتے ہوئے
اپنے ملبوس سے آزاد کرتے ہوئے
اِدھر آؤ
تم پتھر نہیں ہو، خواب نہیں ہو
تو کیا تم
ایک ماہی خوش رنگ ہو
جو میرے پریم جال میں
ہمیشہ کے لئے آ گئی ہو
تم ایک حسین حادثہ کی جان ہو
جو میری ہزاروں رگوں میں
ایک آنکھ بن کر جاگ رہی ہو
میں کہ جیسے

حادثۂ زندگی نے
ریزوں میں بانٹ دیا تھا
ایک اجنبی لمحے میں
تم نے اُس کو ایک جان کر دیا
اور میری زندگی پر
سکون کی شبنم برسائی

جب میری دو آنکھوں نے
تم کو پرکھا
اپنے احساس کی ان گنت انگلیوں سے چھوا
تو تم نے
میری کوتاہی دامن میں
سونے کے خزانے لٹا دیئے
اب میری آرزوں کے سفینے
عشق کے سمندروں میں
رواں دواں ہیں
عشق اگر جیون کی مٹھاس ہے

تو عاشق ایک پھول ہے
میں وہ پھول ہوں
جسے تمہاری انگشت حنا بستہ نے کھلایا ہے
تمہاری بانہیں
کھیت پر رقص کرتی ہوئی چاندنی کی مانند
مُلائم ہیں
مجھ پر ان بانہوں میں کیا گزری
تو سنو

جیسے اوّل اوّل
لپکتی ہوئی اگنی نے رشیوں کو گیت دیئے تھے
میں ایک کرن کی تلاش میں
ایک نغمے کی لکیر پیٹتا ہوا
تم تک پہنچا ہوں
صدیوں کی شعاعوں میں

نہاتا ہوا
لمحاتِ غسل میں

گاتا ہوا

میں اپنے آپ تک پہنچا ہوں

دھند کے سائے

یہ رات کیوں آتی ہے
کون اسے آنے دیتا ہے
کون سانجھ کے سانولے چہرے پر
نقابِ شب چڑھا دیتا ہے
میں ہر رات کی آواز پا سے ڈرتا ہوں
جس کے بال ڈراؤنے
اور صورت بھیانک ہے
رات میں تارے بھی
دانتوں کی مانند نظر آتے ہیں
اُف یہ رات!
اماوس کا اندھیرا محیط ہے

ڈراؤنے خوابوں کی گپھا
میدانوں میں تصور کے بھیانک سائے
اور خیالات کے کیڑے مکوڑے ہیں
ظلمت کے لحاف میں
اپنے چہرے کو چھپا لیتا ہوں
خود تنقیدی کے خنجر کو
اپنے سینے میں اتار لیتا ہوں
خون کے فوارے رہ رہ کر پھوٹ پڑتے ہیں
آنے والی کل کے کناروں پر
بدنما داغ بن جاتے ہیں
ماضی کا پنجر
یاد کے جھروکوں سے جھانکتا ہے
اور وقت کے سکون کو لوٹتا ہے
فضا کو آلودہ کرتا ہے
امن
تخلیقی ذہن کے لئے
نفسِ حیات سے کم نہیں

جو عریاں حقیقتوں کے پرتوں پر
ظاہر ہے
اور پرتوں کے دامن میں
زندگی کا کف آلودہ سمندر
ہر دم چیختا رہتا ہے
ہڈیوں تک میں متحرک تجربات جذب ہو جاتے ہیں
اور وقت کا بھوکا بھیڑیا
حقیقت کے زخمی بدن سے خون چاٹ چاٹ کر
بھاگ جاتا ہے
اور ذہن
مرغی کی طرح
بیضۂ آفاق پر بیٹھ کر
ناپسندیدہ خیالات کی آنے والی ایک نسل کو
سینکتا ہے

اے مینارۂ نور
اے جانِ صداقت

تم نے زندگی کو متحرک کر دیا
امیدوں کو کیوں کجلائیں
پیچھے سرکتی ہوئی اور جلتی ہوئی امیدوں پہ
اس دردناک منظر پہ
چلمنیں چھوڑنے کے لئے
آخر تم کیوں نہیں آئیں ؟

●●

کسی تصور کی آہٹ سے لب وا ہو جاتے ہیں
دو بول
دو پنکھ بن کر
نیل گگن میں میرے وجود کو لے اڑتے ہیں
ایک پنکھ گیت بن جاتا ہے اور دوجا نامہ بر کبوتر
وہ لمحۂ سکون
جو برگِ گل کی نیند کے گھونگھٹ میں
پوشیدہ ہے
کس طرح عروسِ دل بنے گا
پھولوں کے نگروں میں
زر ریشۂ زیست کی راہوں پر
رنگین خیالات کی کلیاں چنی ہیں

اب وہ کالے کالے وجود کے بادلوں پر سج جائیں
تو کیا
دھنک بن کر کھل جائیں گی
مخمور و مستور لمحوں کی چلمنوں سے
جو میری جانب دوڑتی ہیں
وہ کیسی نظریں ہیں
ماہیِ بے آب

کب سے یہ کھوج، یہ پیاس چلی آرہی ہے
طلوع و غروب کے سورج سے پرے
ناامیدی کی ریگ صحرا میں رینگتی ہوئی
ان سبز کھیتوں میں جہاں چاندنی لوٹتی ہے
جہاں بادلوں کے غول
شفاف آسمان کی کیاریوں میں
چرتے رہتے ہیں
منڈپ پر
بارش کے معصوم قطرے رقص کرتے ہیں

دریچوں کی دراڑوں میں
سرد ہوا بولتی ہے
بدن میں چبھتی ہے
ذہن
گویا کاغذ کی ناؤ ہے
تنہا تنہا بہنے لگتا ہے
رات کی پرچھائیوں میں
ساون کی رم جھم میں
آؤ جانِ بہار
ایک مقدس لمحہ بن جاؤ
چاندنی کی کرنوں سے بنا ہوا لبادہ
تاروں کے ہیروں سے بنے گئے ہار
تیرے منتظر ہیں
عطرِ سخن سے میں نے
اپنے دل کی گلابی بھر لی ہے
تیری راہوں میں
ہر پل

خیالات کے منقش قالین بچھے ہیں
آہستہ چل آہستہ

ہجومِ گل
شاخوں کی باہنوں میں مستِ خواب ہے
سانس معطر ہے
خاموشی خمار بن گئی ہے
جیون آکاش چاندنی اگل رہا ہے
دل
دیوالی کے انار کی طرح
نور کے پھول اچھال رہا ہے
کیوں تم میرے خوابوں کو
اشکوں میں نہلاتی ہو؟

یہ دن
سوکھے پتوں کی طرح ٹپک جانے سے پہلے
آجاؤ
یہ چند لمحے غنیمت ہیں

آجاؤ
کہ میں تمہاری گل بدنی کو
اپنی سانسوں میں جھلا سکوں

آج شفق کا آنچل
خونِ دل کی جھیل میں بھیگا پڑا ہے
غم و مسرت کے سیّال آتشیں سے
جامِ حیات کو پر کرنا ہوگا
رنج و شادمانی کے مخملیں پیراہن
زیبِ تن کیے
دکھ بھرے افسانوں کی سنہری دستار
زیبِ فرق کیے
اب بھی وقت کی دہلیز پر اونگھتی ہوئی آنکھیں
منتظر ہیں
جب نینوں کے کنول تم پر کھلے
تو نیند بھونرا بن کر اڑ گئی
اعصاب کی طنابیں بج اٹھیں

اور دل تال پر دھڑکنے لگا
بدن میں موجِ خوں بل کھاتی ناگن کی طرح
رقصاں رقصاں ہے
کسی ویران مندر میں
امید کی آرتی جلتی ہے
دوڑتی، چھاتی، بسیط تاریکی کے
ان آخری لمحوں میں
جیون جیوتی
مشتِ احساس میں
آوازِ پا کی سحر تک
چلنا چاہتی ہے

یہ رات

(۳۱ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو ناگر جنا ساگر میں لکھی گئی)

یہ کون یادوں کے پتھروں کو کُرید رہا ہے
ستارے نکیلے ناخنوں کی طرح
خون آلودہ زندگی کا جشن منا رہے ہیں
کیسے بھول جاؤں
کہ آج تجربات کا تجزیہ ہو رہا ہے
میں کیا جانوں یہ کیسے پیغامات ہیں
بادِ صبا کیوں نغمہ ریز ہے
یہ کس گلشن کے
کس جنت کے نغمے گا رہی ہے
یا پھر میرے ذہن و فکر کو لوری دے رہی ہے
در حقیقت یہ اک لمحۂ بہار کو
جگا رہی ہے
جسے میں کھو چکا تھا
کب اور کہاں کچھ یاد نہیں

یہ خوشبوئے بدن جو اس رات کی لہروں میں
نکھر رہی ہے بس رہی ہے
اس نے کتنے رنگین اور دلکش دکھوں کو
اپنے سینے سے لگا رکھا ہے
جیسے ایک ننھا نشتر
جو وجود کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہے
برسوں پہلے اک شئے
بھول کے سمندر میں غرق ہو گئی تھی
آرزو کے پنکھ
پھڑپھڑا رہے ہیں
دل کے کھنڈروں میں
کھوئی ہوئی چاندنی پکار رہی ہے
ہوس کے ہونٹ
چاندنی کے پیالے کی سمت
بڑھ رہے ہیں
ہنگامِ شب خاموشی کی مکڑی
ناامیدی کے جالے بُن رہی ہے

بس ایک آنسو
گوشۂ چشم میں لرزاں ہے
یہ غم کا سفیر
تنہا تنہا
شانِ خسروانہ سے خراماں ہے
رنگین یاد منجمد ہو گئی ہے
ماضی کے جانے کا ماتم نہیں
مگر یہ زخم
یہ کسک
یہ خون کیسا ہے

سینکڑوں نکہتیں
ہزاروں سرگوشیاں
لاکھوں رنگینیاں
یہ اندر جال کیسا محیط ہے

ایک ماضی

آنکھوں میں
غروب اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طرح
گھر کر چکا ہے
دور کوئی ترانہ ابھرتا ہے اور ڈوب جاتا ہے
میرے تحت الشعور کو جگاتا ہے
ہزاروں نرم انگلیوں سے
ہر بُنِ مو کو چھوتا ہے، بہلاتا ہے
محبت کے کنج میں
چنبیلی کے پھولوں کو چننے کے لئے
نکل چکی ہے
کب؟
نہیں معلوم
احساس
روز و شب کی آغوش میں
اور یادوں کے گرم لادے میں
تیر رہا ہے
حادثات

وقت اور فاصلے کے کناروں سے
لمحہ لمحہ دور ہوتے جا رہے ہیں
چڑھتا سورج
غروب ہوتے ہوئے سورج سے زیادہ تیز ہے
شفق کا پیراہن
دُور دُور تک
دشاؤں میں لہراتا ہے
شنیدہ نغموں سے زیادہ
وہ لہریں غم انگیز ہیں
جو دل میں اتر جاتی ہیں
غم کے افسانے نیش زن ہیں
دلوں کے داغ اونچی آواز میں بولتے ہیں
حادثے کی یاد گہری ہو جاتی ہے

آنکھوں کے تال
جن میں نیلے سائے متحرک ہیں، بول رہے ہیں
جنھیں میرے ہزاروں کان سُن رہے ہیں
یہ رات نہیں

ایک لمحہ ہے
جس میں ان گنت جواہرات کی فصل
کاٹی گئی ہے
مسرت، جیسے ہاتھی دانت کے پھول
امیدیں، جیسے نیلم
ناامیدی، جیسے سیاہ موتی
جشن، تقریب، انگارے
پتھر کے کھائے ہوئے بدن
بھول اور یاد
ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں
پھر اس لمحۂ بیش قیمت سے
جیون کے لہو سے
زندگی کا دودھ نچوڑتے ہیں

آج دل بے قابو ہے
خود کو اس رات کے حوالے کر دو
ڈھیر سے ڈھیر سے

اپنی روح کے سَرگم کو
نغمہ ریز کرو
یہ مقدس لمحہ ہے
عرقِ گلاب سے دھویا ہوا ہے
اور رات
مرطوب ہے
نغمہ بلب ہے

▲▲

خارزاروں میں
وقت
پھول کی طرح مسکراتا ہے
ہم اپنی صدی کے خواب ہیں
چلو اپنے عہد کے خشک گلو کو
اِس لمحۂ غنیمت کے ٹھنڈے پانی سے تر کرلیں
وہ لمحہ جس نے مجھے زندگی کی مسرت دی
وہ لمحہ جو میں نے تم کو سونپا
وہ لمحہ کوئی برگِ آوارہ تو نہیں
کہ ہوا سے اُڑ جائے
لیکن وہ دامانِ خیالِ یار ہے
جو پنکھ کی طرح لہراتا ہے

جو کنول کی جھیل کے سینے سے گزرتا ہے
اور میں وادیوں میں، باغوں میں
اس سائے کا تعاقب کرتا ہوں
اور چھو لیتا ہوں
میری آنکھوں میں جھانکو
اس شئے کو تلاش کرو

جو وہاں ہے
خون کے دریاؤں سے پرے
غروبِ آفتاب کے سیندور کی حد سے دُور
کالی کالی راتوں سے آگے
جو چاندنی برساتی ہیں
دیکھو
میں نے اس پاکیزہ لمحے کو
خون رستے ہوئے موسموں سے چھینا ہے
جواب تک بھی خون آلودہ ہے
میں نے غروبِ آفتاب کے زخمی سینے سے
یہ چیخ چھین لی ہے

حق بانگا ہے
اک نفس
جو سرسبز چراگاہوں میں تم پر اور مجھ پر
مسکراتا رہا ہے
جو دکھ اور مسرت
نفرت و محبت سے بالاتر ہے

اگر یہ لمحہ ادھر نہیں اترتا
تو بہاریں نابینا رہ جائیں
اور آنکھیں زخمی ہو جائیں
اس میں سود و زیاں کی کیا بات ہے

آکاش کا دل بے چین ہے
سینوں میں طوفانِ حوادث ہے
دریا کی آنکھیں بھی خشک ہیں
ماضی کے
سونے چاندی کے اوراق

جیون کی آندھی میں
چمکے تڑپے
جیسے ننھے پنکھ شاہین کے پنجے میں

ماضی کیا کہتا ہے
ویرانی کیوں روتی ہے
کچھ تو کہو
کیوں انسان کا ذہن
زندگی سے ڈر رہا ہے
کیا کوئی تیغ چمکا رہا ہے
یا کوئی ہرنی سگ گزیدہ ہے

یہ تحفۂ روز و شب
اور یہ لمحہ
بطنِ صدف میں محفوظ ہے
ہزاروں مسلسل ہلال دیکھے ہیں
ان آنکھوں کی گہرائیوں میں

جن میں کنول کھلتے ہیں
میری نگاہوں میں نشستِ خواب کے لئے
سنہرا تخت کب سے جلوہ فگن ہے
اس دو رنگی دنیا میں
سپنے پھر سپنے ہیں
چلو
انھیں کو عظیم اور مسرت آمیز بنائیں
نیم وا آنکھیں ہیں
تبسم ضیا پاش ہے
وقت اگر دستک دے
تو اپنی آنکھوں کے گھونگھٹ کھولو

ذہن، شدتِ غم اور افسردگی
سے آشنا ہے
جیسے قیدی قفس سے مانوس ہو
بادلوں سے صرصر و طوفان
اور اندھیروں سے زندگی کیوں کھیلتی ہے

اک بار نظر تو اٹھاؤ
سویرے کی سرخ کرن پھوٹ رہی ہے
امید کی یہی کرن
ہاتھوں میں کُم کُم بھر دے گی

اے تشنگیِ زیست، لوٹ آ
تیرے گلو کو عرقِ محبت سے تر کروں گا
کاش اس لمحۂ محبت کو
ہم قطرہ قطرہ پی جائیں
پھر امرت کا ایک قطرہ
جیون کے زہرِ ہلاہل میں ملائیں
اور اندھیرے کی نقاب کو چاک کریں
پھر سنہری صبح کے پانی سے
ہم رات کے چہرے کو دھو ڈالیں
اور کچھ دن جی لیں
مجھے گمان تک نہ تھا
کہ زندگی ایسی بھی ہوتی ہے

اس لمحۂ نور سے پہلے
مجھے نہیں معلوم تھا
کہ کسی وجود سے میری آنکھیں منوّر ہو جائیں گی
مجھے احساس تک نہ تھا
کہ رات کا پردہ اٹھ جائے گا
اور سحر کا طوفان بڑھتے بڑھتے
اندھیروں کے شانوں تک پہنچ جائے گا
مجھے امید نہ تھی
کہ روحِ خسروانہ کے سائے
میری خاموش آنکھوں کی جھیلوں میں
بہنے لگیں گے
راتیں پہلے بھی تھیں
لیکن
ان میں کوئی آہٹ
کوئی سرگوشی نہیں تھی

موسم کی آواز

گل زاروں اور روشوں کے
عاشقِ آوارہ کی طرح
کوئل پھر آئی ہے
تیری کوک
تھکے ماندے مسافر کے لئے
اک تسلی ہے
دولہن کی طرح جنگل سجے ہیں
پھولوں کے گلدستے، جواہر کے خوشے
آکاش کی نیلمی جلد پر
سوز و درد کی پیٹھ سہلا رہے ہیں
لہسنیوں کی، پیلے پیلے پکھراجوں کی بارش ہے
اودے ہرے کہساروں کے پگھلے ہوئے رخساروں پر
میرا کوئی بسیرا نہیں ہے
پودا کہاں اگاؤں گے
کلیوں کو کیسے چنوں گے

دل

روح کی مٹی میں پھول کھلانے کو
مضطرب ہے
نگاہوں کی رنگ برنگی تتلیاں
کاغذ کے اڑتے ہوئے پرزے ہیں
یا پھر گزرے ہوئے کل کے مبہم مبہم خواب ہیں
جن کو وقت کی نسیم سحری کے جھونکوں نے
اڑا لیا ہے
شاید یہ وقت کے پنجوں سے کبھی نہ چھوٹ سکیں
اے خواب کے متوالے
خوابیدہ وجود
حیاتِ مکمل اک کھوج ہے
تمہارے انتظار میں
آنکھیں
کئی بہاروں کے گیت گا چکی ہوں گی
اور آدھا جیون بیت چکا ہوگا
کبھی کبھی یہ مقدر

کانٹوں پر بھی تُلتا ہے
لیکن حالات
ہونٹوں پر تبسم پہنتے ہیں
اور شہد کی نگاہوں سے چھوتے ہیں
تم کیوں اس طرف نگاہ کرتی ہو
ننھے پرندوں کے نازک دل
شاخوں کے جھروکوں میں
جیون کی پرچھائیوں کا رقص دیکھ کر
کانپ رہے ہیں

تم اپنی مسکراہٹ کی قوسوں کو
صرف پھولوں کے ہونٹوں پر رکھو
تم ہر شب چاندنی کے چشمے سے نہا کر
مہتاب بن جاتی ہو
اور رات خوشی سے کانپنے لگتی ہے
کیا کوئی برگِ گُل سے ہیرے کا جگر کاٹ سکتا ہے
کیا کوئی آہ کو بہار کی زلف سمجھ سکتا ہے۔

زمرد کے پرندے بن کر
کون سے خواب اڑ سکتے ہیں
شاخساروں میں، ہم چلتے رہتے ہیں
دُور دُور، ہمراہ
آکاش کا دل جب سُرخ ہو جاتا ہے
اور سورج
زخم کی انگشتری میں نگینے کی طرح
بجھ جاتا ہے
دنیا کی آنکھوں میں جو خواب بسا ہے
وہ آشیانوں پر صلیب کی مانند ہے
اگر مقدر تم سے پوچھے
اِس موسم میں اِس رُت میں
تمہاری آرزو کیا ہے
تم یہ کہو گے
سب کے لئے ایک مُشتِ بہار عطا کر
اور میرے لئے
دو محبت بھری آنکھوں کے پیالے چھوڑ دے

▲▲

(فروری ۱۹۷۲ء — تاج محل سے متاثر ہو کر)

عظیم خوابوں کے نازک پنکھ
انسانیت کی چشمِ افق پر
لہراتے ہیں
اندھیرے کی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتی ہوئی
آنے والی صدیاں
ہنگامِ سحر جاگتی ہیں
میں
خواب میں
صدیوں کے کلسوں کو

اُمیدوں کی گنبدوں کو
اپنی نگاہوں سے چھوتا ہوں
گونجیں
نوالیوں کے قدموں میں
آرہتی ہیں
خاموشی
نغموں کی آہوں میں
سوجاتی ہے
ان برجوں کو ان گنبدوں کو
حقارت سے نہ دیکھو
یہ وہ عمارتیں ہیں
جو صدیوں کے کنگنوں کی کانچ سے
بنائی گئی ہیں
رخساروں کو سورج کی شعاعوں نے گلابی بنا دیا ہے
جن پر ابھی انسانیت کے بوسوں کے نشان
چمک رہے ہیں
یہ چاندنی راتوں میں قاتل بن جاتے ہیں

اور عاشقوں کے دل دھڑکنے لگتے ہیں
کون اشکوں کی زنجیر پھینکتا ہے
بے کسی کے سینے میں ایک تازہ زخم
اور اپاہج پیار پہ ایک تازہ وار
جواں مردوں کو سدھا کر رونا سکھاتے ہو
اور روشن جھیلوں کو کیوں خون سے بھر دیتے ہو
یہ چمکیلی، سبز، بادامی، کاسنی، نیلی، کالی آنکھیں
جیسے دمکتے جواہر ہیں
جن کی پلکوں سے ابھی تک
دودھ کی خوشبو آتی ہے
جہاں امید، شبنم معصومیت پر پلتی ہے
اگر جیتی جاگتی صبر کی طنابیں ٹوٹ جائیں
اگر مقتول امیدیں جاگ پڑیں
تو انسانی کرب زندہ سورج کی آنکھوں کو پھوڑ دے گا
جو انسان کی آنکھوں میں
جھوٹ کی برچھیاں بھبھوتی ہیں
روشنی راکھ بن جائے گی

اور گرد کا ڈھیر بن کر گر جائے گی
سمندر اڑ جائیں گے
خواب کے پنکھ دھیرے دھیرے ہلتے ہیں
اور گنبدوں کو چھوتے ہیں

▲▲

انتظارِ شب

یہ بھیگی بھیگی پونم کی شب
عریاں ہے
بادِ صبا کے بوسے لے کر
خوشبو کو
اپنے کومل ہونٹوں پر مل کر
میرے کانوں میں
سرگوشی کرتی ہے
میں چشم براہ
تیری آمد آمد کی
قطرہ قطرہ مے پیتا ہوں
جب دل کو سکوں کا نشہ سا
ہونے لگتا ہے
اپنی آنکھوں کے دریچے
کر لیتا ہوں بند
کہیں یہ خواب کے پنچھی

ان سے نکل کر
اڑ جائیں تو کیا ہو
جیسے کمل
اپنے سینے میں
شہد چھپا لیتا ہے
میرے ہاتھ
احساس کی حد سے نکل کر
چندا کی آوارہ کرن کو
پا لینے کی کوشش کرتے ہیں
جو گلشن کے کنج میں جا کر
ایسی پھنسی
ہے
جس کو تیرا آنچل جان کے
میں نے
پکڑنے کی کوشش کی ہے
میری نظریں تھک تھک کر
تیرے نقشِ قدم کو
ڈھونڈ رہی ہیں

چاند

برابر، راہوں پہ کہساروں پر
اک نور اڑاتا رہتا ہے
لیکن میری نظریں
ظلمت کے ریشوں میں جالوں میں
ہر لمحہ الجھی رہتی ہیں
یہ لمبی جٹاؤں والے درخت
نظروں کو آگے بڑھنے سے
کیوں روکے ہوئے ہیں
ڈرتا ہوں میں
یہ چاندنی ساری
خوابوں کے تانے بانے میں کھو جائے گی
پھر تیرے آجانے تک
باقی کیا رہ جائے گا
اک جیون جسمیں خواب نہیں
اک جھیل، نہیں جس میں پانی
اک مانو، جس نے

قوسِ قزح کی پہنی ہو دستار
اک مہتابی ململ کا کرتہ
جو نہ بنا سکتا ہو
اڑتے ہوئے بادل کو پکڑ کر
بنفشئی پاپوش بنانا چاہے
بس سمجھو، وہ آخر میں
اک ایسا تنہا مسافر ہے
اک ایسا آبلہ پا ہے
جو خار آلودہ دھرتی پر چلتا ہے
یا ایسی آنکھیں
جن سے خواب اُڑ جاتے ہیں
وہ خالی نشیمن ہیں
جن سے پرندے اڑ گئے ہوں
یا ایسی سحر
جو خلا کی آنکھوں میں
رقصِ کناں کوکب کے جھرمٹ پر
جھانکتے سورج کا آنچل پھیلا دے

▲▲

گھروندہ

میرے محبوب
تم نے آخر
بوسیدہ کٹیا میں
سورج کی کرنوں کو
چوکھٹ کی پیشانی سے باندھ دیا ہے
بند دروازوں سے بھی گزار کر
تم آسمان کا ایک ٹکڑا
اندر لے ہی آئے
زرد پکھراج جیسا زرریشہ چھڑکا
اور سبز چراگاہوں کو وسعت دی
میرے جذبات کی تپش انگیز دھرتی پہ
میرے تصورات کے کھیت بہار کے گیت گانے لگے
زندگی کی روشوں کو گلِ وجود کی پتیوں نے چوما
چمن کے تمن جاگ پڑے
ایک نئے اور جوان سے موسم کا سامنا ہوا

موسم بھی ایسا
کہ کبھی دیکھا، نہ سُنا
تمہارے قدم جب میرے بوسیدہ گھر کی طرف بڑھے
میں نے خاموشی کا جام پیتے ہوئے
اپنے آپ کو اندھیرے کے جھنڈوں میں چھپالیا
تم وعدہ کی عظمت بطورِ تحفہ
میرے خیالات کی تتلیاں ناچ اٹھیں، امیدوں کی راکھ کیلئے لائے تھے
سورج کی چڑھتی کرنوں میں
خواہشوں کے پھولوں پر
تتلیاں سج گئیں
میں اپنی خواہشوں کو ان سرگوشیوں کے ساتھ کرتا ہوں
جو کل اور آج کے پھولوں سے اور کانٹوں سے
ہم آہنگ ہیں
خون آلودہ زخموں کے منہ بند کرتا ہوں
اور نغموں کو بکھیرتا ہوں
جب بھی فلک پر جامنی بادل گھر آئے
تم نے بیرقوں سے قوسِ قزح سجادی

تم نے مجھے میٹھے لمحوں کے سنہری پھول دیئے
جو خالص سونے اور سورج سے بنے ہوئے تھے
اور زندگی کے لبادے، محرومی کے تانے بانے سے بُنے تھے
لیکن آج امید نے رفو کر دیا

تم نے نارنجی شام سے میرا پیچھا کروایا
میں نے دیکھا
اس کی پیشانی پر رات کی گہری لکیریں تھیں
زندگی کے ناقابلِ برداشت، دکھ کے مزے چکھے
بڑے سوندھے تھے
ایک سانس میں امید تھی دوسری میں دکھ تھا
بالکل اسی طرح
جیسے دن کے بعد رات آتی ہے
بے شک
دل کی وادی میں جہاں دُکھ بستے ہیں
وہی تو جگہ ہے
جہاں سخن کی آنکھیں کھلتی ہیں

آنسوؤں کے مہین نقاب
آہ و بکا کے آبشار
سب مل کر ایک سنگین ہاتھ کو بلاتے ہیں
حروف بڑھتے ہیں
اور اُمید پھر سے جاگ پڑتی ہے

زندگی مجھ سے کہتی ہے
کہ جب تک انگور نچوڑے نہ جائیں
شراب نہیں بنتی
جب تک گنّے کو شکنجے میں نہ کسا جائے
رس نہیں نکلتا
گویا جب تک زندگی کی کڑوی شراب نہ چکھ لے
انسان بے شعور رہتا ہے
تم نے مجھ سے محبّت کا ایک جام مانگا تھا
جسمیں میرے تجربات و حوادث کی برف پڑی ہو۔

تم نے
اپنی بے خواب سیاہ خلاؤں میں
دیارِ انجم کی مُسکانیں
اور آفاقی تنویریں
سجالی ہیں
میری بے کیف تنہائی میں
صحراؤں، ریگ زاروں کی دھول
اور آنسوؤں کے چمکتے ہیرے بھر دیئے ہیں
صبا تمہارے اطراف مچلتی ہے
عروسِ نو کی خوشبو
موسمِ جوانی کی طرح نکھرتی ہے
آگ میری اُن انگلیوں کو خاکستر کر رہی ہے
جو کاسہ بکف ہیں
وہ کاسہ

جس میں سیاہ منظر کا درد
اور چکنا چُور دل تھا

وقت کا پنچھی ہواؤں میں دائم اُڑ رہا ہے
آدم کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہے
غمِ زندگی کا بوجھ
آرزو کی دھنک کے پردے میں
خندہ زن ہے
کون ہے
جو اس ہمہ رنگی جال سے بچ سکتا ہے
کوئی تو بتائے کہ ہم
کس راہ پر، کیوں اور کب چل پڑے ہیں
یہ راز شاید ماورائے نظر ہیں
آدھی رات گئے سناٹوں کے مے خانے سے
صبا کی معطر زلف لہرانے لگی
پورب کے سنہری نقابوں کے پیچھے
اونگھنے والے طائر

اُوشا کی گرم لالی میں جاگ پڑے ہیں
اُمید کا سورج سامنے ہے
مسرت کی جھیل چھلک رہی ہے
ٹھنڈا عطر بیز آبِ رواں منتظر ہے
چلو چلیں اُن کناروں تک
جہاں
تکمیلِ خواہش کے کمل
زر ریشے اگل رہے ہیں

سوغات

(۱۷/ اگست ۷۲ء رفیقۂ حیات کی سالگرہ کے موقع پر)

یہ وہی دن ہے
جو سرابوں کی آنکھوں کو چھُو کر
نیلے جزیروں سے ہوتا ہوا
دھوپ اور چاندنی کو پیتا ہوا
آیا ہے

میرے ذہن کی وادیوں کو
سانس لیتے زمردوں کی مانند
سرسبز رہنا ہے

جہاں پری چہرہ رقص کریں

یہی تو وہ دن ہے
افقِ چشم پر
مہتاب سے باتیں کرتا
اور سورج سے سرگوشی کرتا ہے
مسکراہٹ بن کر
تمہاری ماں کے ہونٹوں پر
محبّت کے ساغر انڈیلنے لگا ہے
جس کا عکس سخن کے اوراق پر
شاہ نامہ بن کر چمکے گا

▲▲

رقصِ بہار

رُت پلٹ آئی ہے
اے پھولوں کے ہم راز
جاگ
ماحول کے شیریں لب
تجھ سے ہم کلام ہیں
اے عشق کے دریا !
او پریم نَین !
بولتے پربتوں، جاگتی وادیوں میں
مور کے پنکھ جیسے پہاڑوں میں
نورنگ بہاروں کا رقص رچا ہے
تبسم کے ریشم سے دل کے زخم رفو ہوتے ہیں
ٹوٹے سپنوں کے ہار پروئے جا رہے ہیں
بہنے والے اشکوں کو پلکوں پر ٹھہرا لو
یہ جیون کے سچے موتی ہیں
چلو چلیں
یہ ایک مہکا ہوا بہکا ہوا جھونکا ہے

اور اس لمحۂ عظیم نے ہم کو
مرکزِ نگاہ بنا دیا ہے
چلو ماضی کے برگِ چکیدہ کو بھلا دیں

یہ پہاسپن اور سرگوشیوں کی رُت ہے
تبسم ہر سمت بکھرا ہوا ہے
زندگی کھینچی ہوئی کمان کی طرح چوکس ہے
لپکتے دوڑتے آبشار
کہساروں کی گود میں چھلکتے ہیں
یہی دل کے جذبات و احساسات
اور یہی اپنی محبت کی نشانیاں ہیں

چلو چلیں
اس جیون میلے کی اور
پھر جھولیں اُمیدوں کے جھولے میں
اُوشا کے گلابوں میں
مغرب کی سرخیوں میں
بلبل کے مچلتے ہوئے نغموں میں

یہ عالم
ایک رنگین نشیمن ہے
دو تنہا تنہا وجودوں کے لئے

یہ چاند
ستاروں کے آئینوں کے جھرمٹ میں ہے
پھر بھی تنہا بہ تقدیر
اکیلا مسافر
ریگستانِ افلاک پر
منزل کا متلاشی
اگر تم وہاں نہ ہوتے
درختوں کی شاخوں میں صبا کا گزر نہ ہوتا
پرندوں کے سینوں میں کوئی گیت نہ ہوتا
وادیوں میں پھولوں کے آنچل نہ ہوتے
باغ میں خوشبو کی آہٹ نہ ہوتی
اور ساری راہیں بجھ جاتیں
اگر تمہاری انگلیوں کو سہارا مل جائے
تو زخم تک مسکرا پڑیں گے

من کی کوئل گائے گی
رت نکھر جائے گی

آپ رواں ہیں
ہم پھولوں کی دو کشتیاں ہیں
شاخوں پر دو چکور ہیں
مَنڈوے چڑھتی دو بیلیں ہیں
جیون اک پربت ہے
پہاڑ قلب و دماغ میں جلوہ گر ہے
چلو
یہ لمحۂ شیریں ایک نعمت ہے
دوسرا لمحہ شاید کڑوا کسالا ہو
یہ دنیا پیوندوں کا ملبوس ہے
جیون آخر جیون ہے
اور تم
اپنے شیش کے لئے
سب کچھ ہو، سب کچھ ہو

▲▲

طوفان

کتنے چیختے طوفانوں
کتنے خاموش ساحلوں
کتنے دہکتے سورجوں کو چھو کر
سحر
انسانیت کے دل سے طلوع ہو رہی ہے
دُور جنگلوں سے مہکتی سانسیں
صبا کے دوش پر آئی ہیں
وہ حسن، وہ چال
وہ ادا، وہ بانکپن
جن سے ہم آشنا نہیں
سحر کی مدھ بھری آنکھوں کا پیام
نئی آوازیں پکارتا ہے

ایک موجِ خواب
شباب آشنا تھی
عہدِ نو کی کناروں پر جبیں گھستی ہے

انسان

اس خونِ سحر میں نہا کر اور نکھر جاتا ہے
اور ذہنوں کی تقسیم کرنے والے آہنی پردوں کو
چیرتا ہے
وہ ہزاروں کچلی ہوئی آہوں کے ضمیر سے
تلوار بناتا ہے
اور اپنی نیام کو کندن کی مانند چمکاتا ہے
انسانیت کا سورج
ذہن کے ایوانوں میں معلق ہے
گویا شعلوں کا خوشہ

برگِ خشک کی مانند
بولیاں اڑ رہی ہیں
ملکوں کی سرحدیں تھرا رہی ہیں
طوفانی ہواؤں میں انسانیت کی آنکھیں
نئے حادثوں کی مے پینے کو کھلی ہوئی ہیں

انسان

دکھ کا ایک سورج ڈھلتا ہے
اور دوسرا ابھرتا ہے
بے چینی کے شعلوں کو بھڑکاتا ہے
سحر، چہرے بدل بدل کر لوٹتی ہے
اشجارِ زندگی جو کل تک شبنم برساتے تھے
آج ان کے پھول، شعلے اور تلوار بن گئے ہیں
کہساروں میں
ندیوں کے بھنوروں کی آوازیں بھی منجمد ہو گئی ہیں
زندہ اور مُردہ مچھلیاں بے حس خوابوں کی موجوں میں بہتی رہتی ہیں
رات جو کل تک چیخ رہی تھی
کہرے کے بنے ہوئے مہین پردوں کے پیچھے
اور یاسمین کی سانسوں پہ
لیکن، آج چاندنی کی شعاعوں پر سوار ہو کر
بھوک کے وسیع کھیتوں پر سے گزرتی ہے

غیب کا ہاتھ

جس نے فطرت کے چہرے پر بہاروں کے نقوش بنائے
اب تلواروں کے گیت دہانِ زخم میں بھر رہا ہے

میخانۂ گیتی میں حورانِ ظلمت اور مقدر کی پریوں کے سنگ
بیٹھتا ہوں
اور تنہائیوں کی خاموش ندیوں میں بہتا رہتا ہوں
یاد کے دریچوں میں جب جھانکتا ہوں
بیتے زخمی دن شہنشاہ کی مانند سجے سجائے
جنہیں لہولہان تاجپوشی عطا ہوتی ہے
کیوں ہر درد میرے سینے میں پناہ تلاش کرتا ہے
راہگذرِ حیات پر
غم و مسرت میں کوئی فرق نہیں
جس نے موت سے سمجھوتہ کر لیا ہو
وہ کسی عفریت سے کیوں ڈرے
اس کے لئے یہ سب کچھ
ایک کھیل ہے

جوں جوں زندگی کے نقوشِ پا پر چلتا ہوں
میں خود کو وقت کی مضبوط گرفت میں
پا بہ زنجیر پاتا ہوں
تباہی آنکھوں دیکھی تاریخ کے اوراق میں در آتی ہے
جہاں انسان، انسانیت کا خون کرتا ہے
زہر رگوں میں دوڑ رہا ہے
میں یہ بوجھ شانوں پہ سہار کر
جب چٹان پر چڑھتا ہوں
تو یہ وزن قدموں کی رکاوٹ بن جاتا ہے
اور منزل پہ پہنچ کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں
اس ستارۂ صبح کی جانب
جو ابھی تک نہیں اُبھرا ہے

▲▲

نسلیں

آج کا عہد
نئی نسل کی اجنبی خواہشات کو جگاتا ہے
احساس
تجربات و حوادث کی نئی آغوش میں
جاگ پڑتا ہے
ہر سمت انجانی آوازیں
ہر جگہ جشن کے اہتمام
تجربات کے زانو پر
کئی آوازیں محوِ خواب ہیں
نئی نسل تخلیق کی ابدی موجیں ہیں
جو زندگی کی وادیوں سے گزرتی ہیں
اپنی بے نام منزل کی جانب
آج چاندنی کی کرن
جماہی اور انگڑائی لے کر
جنگل کی تنہائی میں اپنے تن من کو

پیڑوں سے ملتی ہے
رات مہتابی کرنوں کے مرکب پر سوار
دور نکل جاتی ہے
سحر کا کنول کھل اٹھتا ہے
ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں پہ
کھیتوں پر، بستیوں پہ
جب طوفانی ہوائیں
ٹوٹتی ہیں
اور بادلوں کے جگر کو چیرتی ہیں
بارود کی مری ہوئی خاک
چیخ کا شعلہ بن جاتی ہے
دھرتی کے افسردہ میدانوں میں
جہاں زخمی انسانی اعضاء
پر و بال کی طرح بکھرے پڑے ہیں
جیسے زندہ درخت کی بے زبان ڈالیاں اور پتے
نئی نسل کے لئے ہم نے کیا سرمایہ چھوڑا ہے
بجز اشک و خون و جنگ

بجز زخم و غم و عسرت
بجز خواب در خواب در خواب
ریاکاری و بُزدلی
نئی نسل جو عہدِ کہن کا سہارا ہوتی ہے
ماضی کے خشک ہونٹوں تک
سورج کے دریاؤں کو کھینچ لائے گی

نیند کی وادیوں میں

ذہن کے دریچوں کو بند کر کے
چاند کو بجھا کر
ستاروں بھرے پردے چھوڑ کر
میں لیٹ گیا ہوں
کچھ دیر تو سو لوں،
جیسے کہانیاں اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کر کے
سو جاتی ہیں
سمندر کی طوفانی موجوں نے پنکھے کا کام کیا ہے
آبِ سیاہ کی چادر کے اس کنارے
جو جھوٹے پیٹے خونیں شراب پی رہی تھی
وہاں یادیں اپنے زخموں کو چاٹ رہی تھیں،
اے ساغرِ غم! ادھر دیکھ
میں، تجھ پہ جان چھڑکتا ہوں
میں غموں سے بھرپورا راتوں پہ جان دیتا ہوں
جو جہادِ زندگی میں شکست خوردہ ہوں

میں تیرے آبِ سیاہ کے سائے میں
پناہ لینے کے لئے آیا ہوں
اس پانی میں نصف شب کا عکس
اور ہزاروں ستاروں کا خون شامل ہے

میری تنہائی کے آئینہ خانے میں
کتنے عکس تم نے چھوڑے ہیں
کتنی روشنیوں کے رقص تم نے پھینکے ہیں
میری امیدوں کی عمر کو چاندنی کی ضیا بخشی
میٹھے لمحوں کو تنہائی کی نعمت عطا کی
اور غم و مسرت کے گلدستے
میرے دل کو سرفراز کئے
اور یہ سب کچھ میرے ایک دل کے لئے تھا
صرف ایک دل کے لئے

تم نے افق پر نیلموں کے پھول کھلائے
امید کے یاقوت کھود کر نکالے

غم و تسکین کے سبز مرہم آسمانوں سے نچوڑے
جو کئی دھنکوں کے دامن میں لرزاں ہیں
وہ آج کے دن پر مسکراتے ہیں
لیکن تم مجھ سے آج سچ سچ کہو
کس کی آنکھوں سے ہزاروں روشنیاں پھوٹ رہی ہیں
بتاؤ تم کون ہو

پرچھائیاں

(شیلگری میں لکھی گئی)

یہ خیالات کیوں دستک دیتے ہیں
ہاں یہ حسین خیالات
میرے غریب گھر کے سناٹوں میں
کیوں در آتے ہیں
میں، ان مہ وشوں کی، ان مہمانوں کی
کیا خاطر کر سکتا ہوں
یہ اپنی چاند کی مہتابی دنیاؤں کو چھوڑ کر
اس گھر میں آئے ہیں
میرا گھر دریچوں کی آنکھوں سے محروم ہے
یہ چہرے ہیں
یا آفتاب کی گلابی کرنوں کے ہجوم
اتر رہے ہیں
اس خانۂ ویران میں
جہاں حادثات ٹوٹی ہوئی کرسیوں کی مانند
بکھرے پڑے ہیں

وہ آتے ہیں سرگوشیاں کرتے ہوئے طوفانوں کی صورت
آوارہ ہواؤں کی طرح
دور وادیوں اور کہساروں کے دامنوں میں
جو خزاں دیدہ اور برگِ چکیدہ کو روندتے ہوئے
اس خالی مکان میں کیوں آتے ہیں
جہاں، خراب کہنہ و بوسیدہ تصویروں کی مانند
دیواروں پر ٹنگے ہیں
کیوں آ رہے ہیں یہ
پرندوں اور بھنوروں کی طرح
گل کے لبوں کو چومتے ہوئے
ننھی ہریالی کے سروں پر جھومتے ہوئے
کیوں اس کھنڈر میں آتے ہیں
جس کی چھت کو تیز ہواؤں کے غصّے نے
پہلے ہی سے اڑا دیا ہے
میں ان کو کیا دے سکتا ہوں
بجز صدائے دل
یک لختِ جگر

جو پلکوں پر لرز رہا ہو
یہ تنہائی ایک نشیمن ہے
دھوپ، بارش اور ہواؤں کا گھر ہے
کیوں آتے ہو
تم نے کیوں میرا انتخاب کیا ہے
میں تو خانۂ ویراں میں فروکش ہوں
میں دور کی دنیاؤں کا ایک خانہ بدوش ہوں
چلے جاؤ، اڑ جاؤ، سفید بادل بن کر
نیلے آسمانوں میں تھرکتے رہو
جاؤ، جا کر بادبان بن جاؤ
اور سفینوں کے سنگ
بحرِ آفاق کے سینوں پر بہتے رہو
جاؤ، تند ہوا بن کر
اَن جانے ساحلوں کی طرف
جاؤ چلے جاؤ سحر بن کر
کل کے گلابوں میں

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ

جامعہ نگر، نئی دہلی

"ہندوستانی ادب" کئی زبانوں اور کئی خانوں میں بٹ کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس لئے وہ جو اس کی وحدت پر نظر رکھتے ہیں مختلف ہندوستانی زبانوں کے بہترین ادبی شاہ کاروں کو "تخلیقی ترجمے" کے ذریعہ اس دیس کے تمام باسیوں تک پہنچانے کی ضرورت پر زور دیتے رہے ہیں تاکہ ہم ایک دریا کو مختلف کوزوں میں اور ایک ساگر کو مختلف گاگروں میں دیکھ سکیں۔

ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب نے جدید تلگو زبان کے مشہور شاعر شیشندر شرما کی منتخب نظموں کا ترجمہ "نیلم کے پنکھ" اسی جذبے اور ضرورت کے تحت کیا ہے۔ اس ترجمے کی یوں بھی اہمیت ہے کہ شیشندر شرما کا سحر انگیز اسلوبِ بیان بمشکل ترجمے کی گرفت میں آتا ہے، جب تک خود مترجم شعر کے تخلیقی عمل پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی نہ صرف ان اوصاف سے متصف ہیں بلکہ وہ تخلیقی ترجمے کے گُر سے بخوبی واقف ہیں۔ اس طرح کہ تلگو زبان کی واردات اُردو کی واردات بن جاتی ہے۔ کیا ذیل کا اقتباس اُردو زبان کا تخلیقی عمل نہیں معلوم ہوتا؟

تم ایک حسین حادثے کی جان ہو
جو میری ہزاروں رگوں میں
ایک آنکھ بن کر جاگ رہی ہو
میں کہ جسے حادثۂ زندگی نے
ریزوں میں بانٹ دیا تھا

تم نے اُن کو یک جان کر دیا

اور میری زندگی پر

سکون کی شبنم برسا دی"

اس شاعرانہ شدت اور حدت کے بے شمار ٹکڑے "نیلم کے پنکھ" میں مل جائیں گے۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ بلاواسطہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہے اس لئے مترجم کو اُسلوبی انحراف کا پورا پورا موقع ملا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اِن ترجموں میں بروئے کار لانے میں وہ ایک تخلیقی فن کار کی مانند کامیاب رہا ہے

"نیلم کے پنکھ" اس قدر سحر انگیز کتاب نہ ہوتی اگر اُس کا خالق ایک معمولی شاعر ہوتا۔ یہ اس قدر حیرت انگیز عناصرِ شعر سے پُر بھی نہ ہوتی اگر اِس کا مترجم قدرتِ زبان و بیان سے عاری ہوتا۔ یہ یقیناً اُردو کے کامیاب شعری تراجم میں ایک اضافہ کا حکم رکھتی ہے۔ جس کے لئے ڈاکٹر غیاث صدیقی لائقِ مبارک باد ہیں۔

حیدرآباد

۲۳ مارچ ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر مسعود حسین

شاعری کا ترجمہ ایسی چیز ہے جو ناگزیر بھی ہے اور ناممکن بھی۔ تخلیقی زبان کے فقید المثال ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ PARAPHRASE خود اپنی زبان میں نہیں ہو سکتا مثال کے طور پر یہی مشہور شعر لے لیجئے۔ آتش

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا۔

کوئی بھی لفظ مشکل یا نامانوس نہیں ہے لیکن اسکے PARAPHRRSE کی مختلف شکلیں دیکھیے

۱۔ میری کیفیت مت پوچھو، میں تو جنگل کی وہ سوکھی لکڑی ہوں جسکو آگ لگا کر قافلہ چل دیا۔

۲۔ میرے بارے میں کچھ نہ پوچھو، میں تو جنگل کی خشک لکڑی ہوں جسکو جلا کر قافلے والے چلے گئے۔

۳۔ میرا حال نہ پوچھو، میں صحرا کی وہ چوبِ خشک ہوں۔ جسے آگ لگا کر کارواں آگے بڑھ گیا

تینوں شکلیں بہ ذاتِ خود اتنی بھونڈی نہیں ہیں لیکن شعر کے سامنے رکھیئے تو بالکل بے جان معلوم ہوتی ہیں۔ اور اگر شعر میں نامانوس یا علامتی اظہار زیادہ پیچیدہ ہو تو PARAPHRASE اس کو بالکل ملیامیٹ ہی کر دیتا ہے جب اپنی زبان میں PARAP HRASE کا یہ عالم ہے تو دوسری زبان میں ترجمے کا کیا حشر ہوگا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ دوسری زبان کی اچھی شاعری کو اپنی زبان میں (ٹوٹی پھوٹی ہی سہی) منتقل کرنا بہرحال اس سے بہتر ہے کہ ہم دوسری زبانوں کی شاعری سے بالکل ہی ناواقف رہیں۔

میں چونکہ تلگو زبان یا اس کے ادب کی روایات سے بالکل واقف نہیں ہوں اس لئے غیاث صدیقی کے تراجم کی خوبیوں یا خرابیوں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہر زمانے اور ہر شاعر کے ترجمے میں اس زمانے کا اور خود اس شاعر کا رنگ ضرور آتا ہے۔ مثال کے طور پر ہربرٹ ہاورتھ اور ابراہیم شکراللہ نے عربی شعرا علی الخصوص متنبی ابو نواس اور امراء القیس کے جو ترجمے حال میں کئے ہیں۔ ان کی فضا قدیم

غیاث صدیقی کے تراجم بھی اردو کی نئی شاعری کا مزاج رکھتے ہیں، یقین ہے کہ شیلندر شرما کی شاعری میں وہ تمام عناصر کم و بیش موجود ہوں گے جو جدید ہندوستانی شاعری کی امتیازی صفات ہیں۔ لیکن یہی ترجمے اگر کسی پرانے خیال کے شاعر نے کئے ہوتے تو وہ عناصر دب جاتے یا مسخ ہو جاتے۔ موجودہ صورت میں ان نظموں کا مطالعہ ایک خوشگوار تجربہ ہے شیلندر شرما کی شاعری روایتی "قسم کی جدید شاعری نہیں ہے بلکہ ایک فعال تخلیقی قوت کا اظہار ہے اس کا سب سے اچھا ثبوت ان کی بہترین نظموں مثلاً سوغات رقصِ بہار، تم وغیرہ میں ملتا ہے شرما کے پیکر مظاہر فطرت کی خوبصورتی کے نازک احساس سے بنے ہیں۔ اس لئے ان میں ایک خوش گوار اجنبیت ملتی ہے۔

میرے ذہن کی وادیوں کو سانس لیتے زمردوں کی مانند سرسبز رہتا ہے

برگِ خشک کی مانند بولیاں اڑ رہی ہیں (طوفان)

ایک نازک خواب ہنس کی طرح بہنے لگا ہے (تم)

چاندنی کی کرنوں سے بنا ہوا ہار تاروں کے ہیروں سے بنے ہوئے بازو تیرے منتظر ہیں (شبنم کے موتی)، ان تراجم کو شائع کر کے غیاث صدیقی ہم سب کے شکریئے کے مستحق ہوگئے ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی

ایک بچہ جو شاعرانہ مزاج لے کر پیدا ہوتا ہے اپنے ماحول کی ہر شے سے متاثر ہوتا ہے۔ شیشندر شرما نے شاعرانہ نزاکتوں سے زیادہ پہاڑیوں، وادیوں، گنگناتی ندیوں اور تلاطم خیز سمندروں سے حیاتِ انسانی کا تقابل کیا ہے ایک پابہ زنجیر شہید کی مانند خود کو غضب ناک موجوں کے حوالے کیا، EPICS کی چاندنی اور انسانی امواج کے کف آلودہ سمندروں سے ہر نسل کی لہریں اکٹھی کرتا اور ریت پر منتشر سیپ پراگندہ اوراق کا فوری صندوق اور تہذیب کی آخری جلتی ہوئی شمعوں سے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے ان کی شاعری میں بچوں کی کراہیں بھی شامل ہیں جو تاریکی سے ابھر رہی ہیں، وہ ہواؤں سے متحرک بنوں میں صبا کے خمِ گیسو تلاش کرتا ہے اور سرو کی سرسراہٹ میں ان کے نظریات کی سرگوشی ابھرتی اور بالآخر نظم بن جاتی ہے ان کے نزدیک تاریکی خودکشی ہے کیونکہ انسان اپنے خوابوں کی دنیا سے برسرِ پیکار رہتا ہے" شیشندر شرما کی شاعری میں وسعتِ خیال نہایت ارفع و اعلیٰ ہے آج بمشکل دس ایسے شاعر ہوں گے جو ان کے مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔"

مہاکوی وشوناتھ ستیہ نارائن

(گیان پیٹھ انعام یافتہ)

آج لسانی اور علاقائی دیواریں کھڑی کرنے کے دور میں "نیلم کے پنکھ" کا دوسرا ایڈیشن چھپنا بڑا خوش آئند ہے لسانی اور علاقائی ہم آہنگی کی جانب یہ روشن اور مثبت اقدام ہے ڈاکٹر غیاث صدیقی قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے تلگو کے مشہور اور اہم شاعر شیشندر شرما کی بیس تلگو نظموں کا ترجمہ کیا ہے جسکو ملک کے گوشے گوشے میں بے حد پسند کیا گیا اور سراہا گیا۔

عابد علی خاں

"نیلم کے پنکھ" تلگو کے ایک ممتاز شاعر شیشندر شرما کی منتخب نظموں کا اردو ترجمہ ہے، یہ تخلیقی ترجمہ ڈاکٹر غیاث صدیقی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔

غیاث صدیقی اردو کے ایک معروف خوش فکر اور پختہ مشق شاعر ہیں، ان کا مجموعہ کلام "آواز کا رنگ" اردو کے ہمعصر ادب میں نمایاں مقام کا حامل ہے ایک اچھا شاعر جب دوسرے شاعر کو اپنی زبان میں ڈھالے تو وہ محض لفظی ترجمہ نہیں رہتا۔ بلکہ بذاتِ خود ایک دقیع تخلیقی تجربہ بن جاتا ہے۔ غیاث صدیقی کا یہ تجربہ کئی حیثیتوں سے قابلِ قدر ہے "نیلم کے پنکھ" جدید تلگو شاعری کا ایک اچھا تعارف ہے جس کی مدد سے ہم ایک اہم ہندوستانی زبان کے موجودہ معیار اور مزاج کو سمجھ سکتے ہیں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اشاعت کے ایک سال کے اندر ہی ختم ہو گیا۔ اردو خوان طبقے میں اس کی مقبولیت دوسری زبانوں کے ادب سے ہماری بڑھتی ہوئی دلچسپی کا ثبوت ہے، ادب کے انسانی اور آفاقی کردار کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دوسری زبانوں کے ادب سے شناسا ہوں۔ غیاث صدیقی اس لحاظ سے ایک خوش آیند اور مستقبل آفریں کام کر رہے ہیں۔

"نیلم کے پنکھ" کی اشاعت نہ صرف آندھرا پردیش میں اردو اور تلگو کے درمیان ربط بڑھانے کا وسیلہ ہے۔ بلکہ پورے ملک میں بین لسانی یک جہتی کو استوار کرنے کے کام میں بھی ایک اہم قدم سمجھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر
شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مصنّف کی دیگر کتابیں

سہراب:

میتھو آرنلڈ کے ترجمے "سہراب و رستم" پر ایک طویل کلاسیکی نظم جو ۱۹۵۱ء میں چھپی جس کا دیباچہ وینکٹا پروا ایّسوراکوولو نے تحریر کیا ہے۔

ریتوگھوش: (موسموں کی پکار)

ایک طویل نظم جو ۱۹۶۳ء میں چھپی، دیباچہ کوی سمراٹ وشوا ناتھ ستیانارائن کا تحریر کردہ ہے اور جس کا انگریزی ترجمہ راجکماری اندرا دھنراج گیر نے کیا ہے۔

نرودونکشترالو: (آدم اور ستارے)

مضامین کا مجموعہ جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

شوداشی:

والمیکی کی راماینا کی تشریح جو ۱۹۶۵ء میں چھپی، دیباچہ گنڈے راؤ ہرکارے نے لکھا ہے۔

سورنا ہمسا: (سنہری ہنس)

ہرشا بھٹ کی سنسکرت کلاسیکی "نیسادھیہ چریتا" کا خلاصہ جو ۱۹۶۷ء میں چھپا۔

ساہتیہ کوموڈی: (ادب کی چاندنی)
کلاسیکی تلگو شعراء اور ان کی تخلیقات پر مشتمل علمی مضامین کا مجموعہ جو ۱۹۶۹ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

اوہالو: آٹھ مضامین پر مشتمل کتاب جو ۱۹۶۹ء میں چھپی۔

پک شلو: (پرندے) ابتدائی مختصر نظموں کا مجموعہ جو ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

دھوالا: (کرب)
مختصر کہانیوں کا مجموعہ جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں چھپا اور دوسرا ابھی چھپ چکا ہے۔

میلو دربارو (بادلوں میں دربار) ایک ڈرامہ جو ۱۹۶۸ء میں چھپا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔

چمپو ونودنی:
طنزیہ و مزاحیہ نظمیں جن کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں اور دوسرا حال میں چھپا ہے۔

شیش جیوتسنا (نیلم کے پنکھ) تازہ ترین نظموں کا مجموعہ جس کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر غیاث صدیقی اور انگریزی ترجمہ راجکماری اندرا دیسنراج گیرجی نے کیا اردو سے ہندی رسم الخط میں لکھا گیا یہ مجموعہ ۱۹۷۲ء میں چھپا۔ تلگو و انگریزی

کا پیش لفظ سری سری نے، اردو کا اختر حسن نے اور ہندی کا ڈاکٹر تیلنگ نے تحریر کیا ہے۔

بودلیئر:
فرانسیسی شاعر بودلیئر کی نظموں کا تلگو ترجمہ جو حال میں چھپا۔

میگھ دوت: (بادلوں کا پیامبر) کالیداس کا مشہور کلاسیکی نظم کا انگریزی ترجمہ جو راجکماری دھنراج گیر کے تعاون سے کیا گیا۔

وشوا وِلوے چِنا: (مطالعہ کائنات)
مضامین کا مجموعہ پہلا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں چھپا اور دوسرا عنقریب چھپے گا۔

منٹ ڈے سر یودو (دہکتا سورج) نظموں کا مجموعہ